ڈاکٹر محمد خالد مسعود

قرآن کی اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ

''حرفِ مترجم''

''اِدہر چند ماہ قبل 'المعارف' میں پروفیسر ازتسو (T. Izutsu) کی تالیف ''قرآن کی اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ'' کے چند ابواب کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تھا، جسے ملک کے اہلِ علم نے پسند کیا۔ ہمارے ایک قدیم کرم فرما پروفیسر محمد انور کھیتران (بلوچستان میں وزارتِ تعلیم کے سابق سیکرٹری) نے مجھ سے کہا: بھائی! یہ تو کمال کے مضامین ہیں۔ قرآن کی اخلاقی تعلیمات پر پروفیسر موصوف نے خوب لکھا ہے۔ چنانچہ خاکسار نے ڈاکٹر محمد خالد مسعود سے درخواست کی کہ وہ پروفیسر ازتسو کی پوری کتاب کا ترجمہ کریں۔ یہ ترجمہ ہمارے معاشرے کی ژولیدگی فکر کا مداوا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف (محمد خالد مسعود) نے یہ ترجمہ اپنی دوسری مصروفیتوں کے باوجود پورا کیا جو اب زیرِ طبع ہے۔ اس کتاب میں فاضل مترجم (ڈاکٹر محمد خالد مسعود) نے حرفِ مترجم کے نام سے ایک قیمتی دیباچہ لکھا ہے، جسے المعارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا انسان کو اس کے داخلی قلق و اضطراب کے لیے کن کن راہوں سے تسکین و قرار کا سروسامان فراہم کرتا ہے۔'' [رشید احمد]

یہ کتاب پروفیسر ازتسو کی کتاب ''قرآنِ کریم کی اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں کائیو یونیورسٹی جاپان سے شائع ہوئی تھی اور اس پر اُنہیں ۱۹۶۰ء میں اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری ملی تھی۔ بعد میں اُنھوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور ۱۹۶۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن میکگل یونیورسٹی، مانٹریال کینیڈا سے شائع کیا۔ قرآن کا معنویاتی مطالعہ کیسے کیا جائے، اس موضوع پر یہ بے حد

وقیع کتاب ہے۔ پروفیسر ازتسو نے اس کتاب میں جو طریقِ کار تجویز کیا، اسے اہلِ علم میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ متعدد محققین نے اس طریقِ کار کو اختیار کیا اور قرآنی موضوعات کے بارے میں بیش قیمت مطالعے پیش کیے۔ ۱۹۸۱ء میں اس کتاب کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر خیال ہوا کہ اسے اُردو قارئین تک بھی پہنچنا چاہیے۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی تحریک پر خاکسار نے ۱۹۹۳ء میں اس کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ چند ابواب کا ترجمہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے مجلّے المعارف میں چھپا تو قارئین نے بے حد پسند کیا اور تقاضا ہوا کہ کتاب کا مکمل ترجمہ شائع کیا جائے۔ المعارف میں جو ترجمہ چھپا وہ کتاب کے ۱۹۵۹ء کے ایڈیشن کا تھا۔ زیرِ ترجمہ میں ۱۹۶۶ء کے ایڈیشن کو سامنے رکھا گیا ہے۔

پروفیسر ازتسو کی یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایک جانب تو یہ کتاب دورِ جدید میں دینِ اسلام کے اس نئے رجحان کی نشان دہی بھی کرتی ہے، جس میں قرآنِ کریم کو مسلمانوں کی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل ہوئی ہے، وہاں دوسری جانب اس بات کی بھی شہادت ہے کہ اس دَور میں قرآنِ مجید کا علمی مطالعہ اور درس و تدریس مسلمانوں تک محدود نہیں رہا۔ پروفیسر ازتسو کی طرح اس صدی میں متعدد غیر مسلم علما نے قرآن کا بغور علمی مطالعہ کیا ہے۔ غیر مسلم علماء کی قرآنِ کریم کے بارے میں تحقیق و تصنیف کی تعداد بلا مبالغہ اتنی زیادہ ہے کہ یہاں ان تمام کتابوں کا مکمل جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جن موضوعات پر جن لوگوں نے کام کیا ہے، ان میں سے بیشتر عنوانات مسلم علما کی تحقیق کا بھی موضوع بنے۔ ان میں سے ایک اہم موضوع قرآنِ کریم کا تاریخی مطالعہ اور قرآنی سورتوں کی تاریخی ترتیب ہے۔ مستشرقین میں سے نولڈیکے، رچرڈ بل اور منٹگمری واٹس کے نام مثال کے طور پر لیے جاسکتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر تحقیق کے نئے زاویے پیش کیے۔ مستشرقین نے اپنے مخصوص علمی اور سیاسی پس منظر کی بنا پر قدرتی طور پر قرآن کی تاریخ کے حوالے سے جمع قرآن اور اس کے انجیل اور تورات سے تقابل کے مسائل میں زیادہ دلچسپی لی۔ حالیہ علماء میں رچرڈ برٹن اور وانس بورو خاص طور پر نمایاں ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک جمعِ

قرآن کا عمل بہت دیر میں مکمل ہوا۔ ہمیں یہاں ان تحقیقات اور ان کے نتائج سے سروکار نہیں بلکہ سردست صرف یہ کہنا ہے کہ غیر مسلم تحقیقات میں بھی قرآنِ کریم کو رمزی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر میں بھی قرآن اور اس کی سورتوں کا تاریخی مطالعہ بہت سے مفسرین اور محققین کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ان میں دیگر علما کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قریبی ساتھی محمد اجمل خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے قرآنی سورتوں کو تاریخِ نزول کے حساب سے ترتیب دینے کی کوشش کی۔

دورِ جدید کے علمی رجحانات کی دوسری خصوصیت جو غیر مسلم اور مسلم تحقیقات میں مشترک پائی جاتی ہے وہ قرآن فہمی کا یہ پہلو ہے کہ قرآن کا بطور کتاب اور ایک اکائی مطالعہ ضروری سمجھا گیا۔ ماضی میں عام طور پر قرآن کریم کی تفسیر آیات اور سورتوں کی ترتیب سے کی جاتی تھی، جس میں ایک ایک کر کے آیت بہ آیت تفسیر درج کی جاتی تھی۔ جس سے یہ تصور ابھرتا تھا کہ قرآن کریم کو دوسری کتابوں کی طرح نہیں پڑھا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر نے اس خیال کو بھی فروغ دیا کہ قرآنِ کریم ایک مربوط کتاب نہیں بلکہ اس کی شکل خطاب کی سی ہے۔ اہلِ علم نے اسے اعجاز قرآن کا ایک پہلو قرار دے کر اس کے بطور کتاب مطالعہ کی حوصلہ شکنی کی۔ عصرِ جدید میں اس بات پر زور دیا گیا کہ قرآنِ کریم کا مطالعہ ایک جامع اور مربوط کتاب کی شکل میں ضروری ہے۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر نے اس طرزِ مطالعہ کی داغ بیل ڈالی۔ متقدمین کے ہاں ربطِ آیات کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے آیات کی کثیر تعداد کو اس لیے منسوخ قرار دے دیا جاتا تھا کہ وہ دوسری آیات کے بظاہر مخالف یا متضاد نظر آتی تھیں۔ شاہ صاحب نے مضامینِ قرآن کی پنجگانہ تقسیم پیش کر کے نہ صرف قرآنِ کریم کا بطورِ کتاب مطالعہ ضروری قرار دیا بلکہ اس کے موضوعات میں ایک بنیادی ربط ثابت کر کے ناسخ و منسوخ کے مسئلے کو نیا مفہوم دیا۔ بعد میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین علی اور مولانا احمد علی (لاہوری) نے ربط آیات پر مزید کام کر کے پورے قران کو ایک مربوط کتاب کی طرح پڑھے جانے کو آسان بنا دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے نظمِ قرآن کے پہلو کا مزید گہرائی

سے مطالعہ کیا۔ برصغیر میں ان پیہم کوششوں نے اس بات کو تقویت دی کہ قرآن کی قرآن ہی سے تفسیر ممکن ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے جزئی مطالعہ کی بجائے اس کا مجموعی اور کلی مطالعہ کیا جائے۔ قرآن فہمی کے ان رجحانات کا اثر اس دَور کی تفسیروں پر بھی پڑا۔ اکثر تفسیروں میں آیت بہ آیت تفسیر کا اسلوب تو اختیار کیا گیا، لیکن ہر سورت کی مجموعی تفسیر اور اس کا تاریخی پس منظر بیان کرنا بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ قرآنی علوم پر الگ سے کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کے اشاریے اور موضوعاتی فہرستیں تیار کی گئیں۔ مختلف موضوعات پر قرآنِ کریم کے مجموعی مطالعے پیش کیے گئے۔

اس پس منظر میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ دورِ جدید میں اجتہاد اور احیائے دین کی تحریکوں نے قرآن فہمی کے ان جدید رجحانات کو مزید تقویت دی۔ تقلید کے دَور میں قیاس صرف فقہ کا ہی اہم ماخذ نہیں تھا، بلکہ علمِ تفسیر، علم الکلام حتیٰ کہ مسلم فکر کا بنیادی طریقِ تحقیق بن چکا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ عام طور پر قیاس کے لیے قرآن کریم کی ساری آیات کی بجائے کسی ایک آیت سے استدلال کافی تھا، بلکہ جہاں آیت سے واضح اور صریح حکم نہ ملتا ہو، وہاں مشابہت اور علت کے اصول پر استنباط کیا جا سکتا تھا۔ مشابہت اور علت کا معیار کیا ہو، اس کا تعین قرآنِ کریم کی بجائے فقہ اور کلام کے اصولوں کی بنیاد پر طے کیا جانے لگا۔ اس سے قدرتی طور پر تقلید کو رواج ملا۔ جو پہلے پہل تو اہلِ علم سے سوال اور مشورے کا نام تھا، لیکن بتدریج یہ شخصی تقلید میں بدل گئی یعنی ہر بات میں کسی ایک امام یا مذہب کی پیروی۔ تقلید کی روایت نے فقہی مذاہب کو استحکام بخشا تو اس کا براہِ راست اثر تفسیر قرآن کے فن پر پڑا۔ قرآن کی تفسیر مضامین قرآن کی بجائے مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے لکھی جانے لگی۔

جوں جوں اسلامی فکر پر روایت اور تقلید کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ قرآن فہمی کا دارومدار روایت پر بڑھتا گیا۔ قرآن کریم نے بندے اور خدا کے درمیان براہِ راست رشتہ قائم کرتے ہوئے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو قرآنِ کریم کے مطالب پر غور وفکر اور تدبر کی دعوت

دی۔لیکن روایت نے اس براہِ راست تعلق کو خدشے کا دروازہ سمجھ کر اسے بند کرنے کے لیے قرآن کے مطالعے میں روایت کی پابندی لازمی قرار دے دی۔خطرہ تھا کہ براہِ راست مطالعہ قاری کو اغراض اورنفسانی خواہشات کی پیروی کی طرف لے جائے گا۔ چنانچہ قرآن فہمی کی صحت کو جانچنے کے لیے روایت کو ہی معیار قرار دے دیا گیا۔

تاریخِ اسلام کی ابتدا میں حدیث کی تحریک اُٹھی؛جس نے حدیث کو قرآن فہمی کی بنیاد ٹھہرایا۔قرآن کی ایسی تفسیر جو حدیث کے عین مطابق ہو،صحیح تفسیر اور تفسیر ماثور کہلائی۔یعنی اثر پر مبنی۔لیکن اثر کی اصطلاح حدیث کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔حدیث سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور فعل ہے۔لیکن اثر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال اور افعال بھی شامل ہیں۔ چنانچہ عملی طور پر اثر سے مراد وہ روایت ہے، جسے صدرِ اسلام میں اہلِ علم کی تین نسلوں کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔اس طرح اثر کی اصطلاح کے حوالے سے خود حدیث بھی روایت کے معنی میں استعمال ہونے لگی۔تفسیر ماثور اسی روایت کی پابند قرآن فہمی کو کہا گیا۔ اس کے برعکس جو تفسیر اس اصول کی پابندی نہ کرے، اسے تفسیر بالرائے کا نام دیا گیا۔ دراصل تفسیر بالرائے اپنی مرضی کی تفسیر نہیں تھی، بلکہ تاریخی اور لسانی سیاق وسباق پر مکمل غور وفکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کا نام تھا۔لیکن تحریکِ حدیث کے پس منظر میں تفسیر بالرائے ذاتی خواہشات کی پیروی ٹھہری اور قابلِ مذمت قرار دی گئی۔قرآن فہمی کو محمود اور مذموم کے خانوں میں تقسیم کرنے کا رجحان تحریکِ حدیث کے بعد اور بھی شدید ہوتا گیا۔ بعد میں فقہی مذاہب، کلامی فرقوں اور صوفی مسالک کی بنیادوں پر قرآن فہمی کو صحیح یا غلط سمجھا جانے لگا۔ یوں صحیح اور غلط کا معیار قرآن سے زیادہ روایت بنتی گئی۔ دورِ جدید میں احیا کی تحریکوں نے روایت اور تقلید کی اس گرفت کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی تو عوام میں قرآن خوانی اور قرآن فہمی کے رجحانات نے زور پکڑا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پوری اسلامی دُنیا میں مسجدوں اور گھروں میں درسِ قرآن کی مجالس عام ہوگئیں۔ان مجالس نے ایسے علما کو ابھرنے کا موقع دیا، جنھوں نے روایتی دینی مدارس میں تعلیم نہیں پائی تھی، لیکن قرآن فہمی کی تحریک اور

قرآن کے اپنے خصوصی اسلوب کی بنا پر عوام کی نگاہ مین علما کا رتبہ حاصل کرلیا۔ ان میں برصغیر میں مولانا ابوالکلام آزاد، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ غلام احمد پرویز اور عبدالماجد دریابادی کے نام بطور مثال لیے جاسکتے ہیں۔

احیائی تحریکوں نے پورے عالمِ اسلام میں قرآن فہمی اور بالخصوص قرآن کی قرآن سے تفسیر کے رجحان کو رواج دیا۔ جدید تفسیریں عربی زبان کے قواعد اور معانی کی بجائے اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر توجہ دینے لگیں۔ مصر میں مفتی عبدہ (م ۱۹۰۵ء) اور رشید رضا (م ۱۹۳۵ء) کی تفسیر المنار نے تفسیر کے اس جدید اسلوب کی مقبولیت میں اضافہ کیا کہ قرآن کو مجموعی طور پر اس کے تاریخی سیاق میں سمجھنا ضروری ہے۔ قرآنی آیات کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر نہیں پڑھا جا سکتا۔ علامہ جوہری طنطاوی (۱۹۴۰ء) کی تفسیر الجواہر نے قرآن کے سائنسی رموز کو تفسیر کا موضوع بنایا۔ شیخ محمود شلتوت کی تفسیر من ھدی القرآن میں اہتمام کیا گیا کہ ہر آیت کی تفسیر کی جگہ ہر سورت کے اہم موضوعات اور احکام کی تفسیر بیان کی جائے۔ دورِ جدید میں تفسیریں اتنی بڑی تعداد میں لکھی گئی ہیں کہ ان کی فہرست تو ایک طرف، ان تمام رجحانات کا سرسری احاطہ بھی ممکن نہیں۔ ان رجحانات میں سے ہم ایک کا ذکر ضرور کریں گے۔ یہ تھا قرآن کی قرآن سے تفسیر کا اصول۔ یہ رجحان دورِ جدید میں زیادہ مقبول ضرور ہوا، لیکن اس کا سہرا امام ابنِ تیمیہ کے سر ہے، جنہوں نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے اصول پر زور دیا۔ مصر میں عائشہ بنت الشاطی نے اسی اصول کی بنیاد پر التفسیر البیانی القرآن الکریم لکھی، جس میں بعض منتخب سورتوں کی تفسیر خود قرآن کریم کی آیات سے ہی پیش کی۔ ان جدید تفسیروں نے قرآن فہمی کو نئے افق فراہم کیے۔ اب تفسیر محض لغوی مباحث اور فقہی احکام تک محدود نہیں رہی، بلکہ قرآن فہمی کے لیے تاریخی اور معنوی سیاق کا سمجھنا ضروری ٹھہرا۔ اس ضمن میں مصری دانشور اور عالمِ دین نصر حامد ابوزید کی کتاب مفہوم النص، دراسۃ فی علوم القرآن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر دَور کا ایک اپنا ادبی ذوق اور معنوی دائرہ فہم ہوتا ہے، جس میں لوگ ادبی عبارات کو پڑھتے اور سمجھتے رہے۔ قرآن فہمی کا بھی

یہی معاملہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، برصغیر میں شاہ ولی اللہ نے قرآن کریم کے فارسی ترجمے اور اصول تفسیر کے ذریعے قرآن فہمی کو روایت کی پابندی سے آزاد کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ولی اللہی فکر کو آگے بڑھایا اور بیرونِ ملک قیام کے دَوران اسلامی دُنیا کے دوسرے علماء کو اس طرزِ فکر سے روشناس کرایا۔ ان میں روس کے مسلمان رہنما علامہ موسیٰ جار اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ جار اللہ چونکہ مصنف کتاب پروفیسر ازتسو کے استاد بھی ہیں، اس لیے ان کا قدرے تفصیلی تعارف پیش ہے۔

وسطی ایشیا اور روس کے مسلمانوں میں احیا اور تجدد کی تحریک میں علامہ موسیٰ جار اللہ (۱۸۷۵ء-۱۹۴۹ء) کا کام بہت نمایاں ہے۔ ان کا تعلق روس کے شہر روستوف سے تھا۔ دینی تعلیم استانبول اور قاہرہ میں حاصل کی۔ مصر میں مفتی عبدہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ جدید قانون میں اعلیٰ تعلیم سینٹ پیٹرز برگ کی یونیورسٹی میں مکمل کی۔ ۱۹۰۴ء سے روسی مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنے لگے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو علامہ لینن گراڈ میں مسلمانوں کے سرکردہ رہنما تھے اور لینن کے بہت قریب۔ انہی دِنوں ۱۹۲۳ء میں ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی کابل سے ماسکو پہنچے تو علامہ جار اللہ سے ملاقات ہوئی۔ پیٹرز برگ میں مولانا علامہ کے گھر مہمان رہے۔ اس زمانے میں علامہ جار اللہ کے اشتراکی رہنماؤں سے اختلاف شروع ہو چکے تھے۔ علامہ اشتراکیت کے ساتھ ساتھ اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی خودمختاری کے قائل تھے۔ اشتراکی حکومت اسے پان اسلامزم قرار دیتی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان کئی بار گرفتار ہوئے، جیل گئے اور جلاوطن ہوئے۔ خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے مولانا سندھی اور علامہ جار اللہ کی دوستی اور گہری ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں روس میں علامہ جار اللہ کا رہنا ناممکن ہوگیا تو وہ ہجرت کر کے افغانستان آ گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۳۵ء میں برصغیر میں بھی آئے۔ حجاز، جاپان اور چین بھی گئے۔ اِدھر مولانا سندھی بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان سے باہر بھی

افغانستان اور کبھی حجاز میں مقیم رہے تو اس دَوران دونوں حضرات میں ملاقاتیں جاری رہیں۔

مولانا سندھی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۹ء کے دورانِ حرم شریف میں مقیم تھے۔ موسیٰ جار اللہ حجاز آئے تو مولانا سے تفصیلی رابطہ رہا۔ انہی دِنوں میں موتمر عالمی اسلامی کے اجلاس میں ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں موسیٰ جار اللہ کی علامہ اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا سندھی نے علامہ جار اللہ کو شاہ ولی اللہ کی فکر سے متعارف کرایا۔ مولانا نے اپنی تفسیر الہام الرحمان علامہ کو املا کرائی جو شاہ صاحب کے انداز سے لکھی گئی تھی۔

موسیٰ جار اللہ خود بھی قرآنی علوم پر کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے تاریخ القرآن والمصاحف، فقہ القرآن الکریم اور حرف اوائل السور شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ نے روایتی طرزِ تفسیر پر جو تنقید کی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی قرآن فہمی کا اسلوب شاہ ولی اللہ اور مولانا سندھی سے کتنا قریب تھا۔ ہم ذیل میں ان کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

> ''مفسرین تفسیر قرآن میں اپنا اپنا اسلوب اپناتے ہیں اور تشریح و استدلال کتبِ اصول سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ کریم کے معانی کو عربی زبان اور روایت کے دو جہتی ڈھانچے میں محدود رکھتے ہیں۔ فکر و تدبر سے مزید معانی معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ آیات احکام سے شرعی اوامر کے علاوہ انسانی زندگی کے اصول وقواعد بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں، لیکن وہ دین کی تشریح میں عموم، خصوص، عبارت، اشارہ، محکم اور مجمل کے طریقِ استدلال کے ذریعے عبارتی نظم کی تلاش تو کرتے ہیں، لیکن انسانی زندگی میں مطلوب ان احکام کی اہمیت اور اثرات پر غور نہیں کرتے۔ فکرِ اسلامی کے جمود کی اور ترقی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ (مقدمہ الموافقات)

علامہ جار اللہ حجاز سے ہندوستان تشریف لائے۔ یہاں سے چین اور جاپان بھی گئے۔ جاپان میں قیام کے دوران زیرِ نظر کتاب کے مصنف توشی ہیکو ازتسو سے ملاقات ہوئی۔

ازتسوٹوکیو یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد تھے۔ علومِ شرقیہ میں دلچسپی تو تھی ہی، علامہ سے ملاقات کے بعد عربی زبان میں شغف میں اضافہ ہوگیا۔ علامہ نے عربی زبان کی متداول کتابوں سے متعارف کرایا۔ علامہ کے ذریعے قرآنِ کریم کے مطالعے کا شوق بھی بڑھا۔ علامہ جاپان اور چین کے بعد پھر ہندوستان آئے تو دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی[1] حکومتِ برطانیہ نے علامہ کی سرگرمیوں کو مشکوک قرار دے کر پشاور میں قید کر دیا۔ نواب بھوپال کی کوششوں سے ڈیڑھ سال بعد رہائی پائی تو بھوپال چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ترکی گئے تو ان کا پرزور استقبال ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود تھا کہ دورِ جدید میں عالمِ اسلام میں مطالعۂ قرآن کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی، اس نے مختلف ملکوں کے ہم خیال علما میں رابطے بڑھائے۔ ان کوششوں میں برصغیر بہت اہم کڑی تھی۔ قرآن فہمی کی اس تحریک کا بنیادی اصول یہ تھا کہ قرآنِ کریم کو الگ الگ ٹکڑوں کی بجائے کل کی حیثیت سے پڑھا جائے۔ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ قرآن فہمی میں روایت کی پابندی کی وجہ سے قرآن کے معانی اس دَور کی قرآن فہمی میں محدود ہوکر رہ جاتے ہیں، جس میں وہ روایت تشکیل پاتی ہے۔ اس طرزِ فکر کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ روایت ان معانی کو اصل معانی کا درجہ دیتی ہے اور عقیدے کی حد تک یہ تقاضا کرتی ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں بھی یہی معنی لیے جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال مسلم اور

---

[1] ڈاکٹر ریاض الحسن نے لکھا ہے: ''موسیٰ جار اللہ تقریباً ایک ہفتے کلکتہ میں ٹھہرے اور ان ایام میں میں ان سے ہر روز جا کر ملتا تھا۔ ایک دِن میں نے اُن سے پوچھا کہ ''آپ کے خیال میں قران کا کوئی فلسفہ بھی ہے، اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟'' کہنے لگے، ''بے شک قرآن کا ایک نظام فکر ہے، جہاں (قرآن میں) اوامر و نواہی موجود ہیں، وہاں زندگی کا ایک مربوط نظام بھی ہے اور اس کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہے۔ یہیں سے سب کلے پھوٹتے ہیں، جن میں عبادات اور معاملات کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر ایمان بالغیب نہ ہوتو انسان کو راہِ راست پر لانے والی اور کوئی چیز نہیں۔'' پھر اس کی اُنہوں نے واقعات کی بنا پر ایک لمبی تشریح کی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ ''آپ کے خیال میں قرآن کے فکری نظام کو سمجھنے والا ہندوستان میں کوئی عالم ہے؟'' تو اُنہوں نے مولانا ابوالکلام کا نام لیا۔'' (المعارف، جنوری-جون ۲۰۰۳ء، ص ۲۰) (ایڈیٹر)

مومن اور مسلم اور کافر کے معانی کا تعین ہے۔ قرآن کریم میں بھی مسلم اور مومن کو ایمان کے دو مدارج کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مسلم اور کافر میں فرق بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کافر کی بنیادی خرابی یہ بتائی کہ کافر خدا کا شکر گزار نہیں ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کا انکار کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا احسان مند اور شکر گزار رہتا ہے۔ اسی احسان مندی سے ایمان جنم لیتا ہے۔ روایت نے ان معانی کو علم الکلام اور عقاید کی باریکیوں میں دیکھا تو مسلم اور کافر کے بنیادی معنوں کی جگہ جن میں انسانی رویے اور کردار پر زور تھا۔ ثانوی معنی پر زور دیتے ہوئے کفر کو عقیدہ اور کلام کا موضوع بنا دیا۔ کافر کا مطلب بے ایمان اور بے دین قرار دیا۔ بلکہ ہر وہ شخص جو کافر کہلایا۔ یہ روایتی معنی غلط نہیں، لیکن اس کی وجہ سے کفر کا ناشکرے پن کا مفہوم کلی طور پر اوجھل ہو گیا۔

پروفیسر ازتسو نے قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا تو اس میں قرآنی الفاظ کے معانی کے لیے لغات قرآنی الفاظ سے ہی مدد لی۔ ان کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جہاں تک ان قرآن الفاظ کا تعلق ہے، جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے لیے قرآن سے باہر کے مصادر پر انحصار صحیح نہیں اور یہ کہ اس کے لیے قرآن کے ذخیرہ الفاظ کو ہی مصدر سمجھا جائے۔ اس میں قدیم لغات یا قدیم عرب شاعری سے سیاق وسباق کے سمجھنے میں تو مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن ان پر مکمل انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قرآن کریم نے عرب اقدار کو نئے معانی دیے۔ پروفیسر ازتسو کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایک لفظ کو لے کر قرآن کریم میں ایسی تمام آیات کا مطالعہ کیا جائے جن میں وہ لفظ اور اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مزید آیات کو تلاش کیا جائے۔ جن میں ان الفاظ کے ہم معنی یا متضاد الفاظ استعمال ہوئے ہوں۔ اسی طرح ایسی قرآنی آیات بھی تلاش کی جائیں، جہاں اس لفظ کی تفصیلی تعریف یا بیان مل جائے۔ اس مطالعہ میں چند آیات کا انتخاب نہ کیا جائے، نہ ہی ان آیات تک محدود رہا جائے، جن سے وہ معانی ثابت ہوتے ہوں، جو محقق کو مطلوب ہیں۔ اس ذخیرہ اور ان کے معانی کے تجزیہ کی

بنیاد پر اس لفظ کا معنویاتی ڈھانچہ سامنے آ جاتا ہے۔اس ڈھانچے میں صرف ایک ہم معنی یا ایک متضاد لفظ پر انحصار نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کی تمام آیات کا احاطہ ہوتا ہے۔معنی تخریج کی بجائے استقرا کی بنیاد پر اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ ان طریقوں سے یقینی طور پر بہتر ہے جو محض ایسی چند گنی چنی آیات پر انحصار کرتے ہیں جن سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو جائے۔مختصراً یہ ہے وہ معنویاتی طریقِ مطالعہ جو پروفیسر ازتسو نے اس کتاب میں اختیار کیا ہے۔اس کتاب کو قرآن فہمی کی ان کوششوں کی ایک کڑی سمجھا جا سکتا،جن کا اوپر ذکر ہوا۔اس کتاب نے مسلم دُنیا کے ساتھ جاپان میں بھی قرآن کے مطالعے کو فروغ دیا۔اس کی تفصیل پروفیسر ازتسو کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتی ہے جس کا مختصر ذکر ذیل میں درج ہے۔

توشی ہیکو ازتسو ۴رمئی ۱۹۱۴ء کو ٹوکیو جاپان میں پیدا ہوئے۔اور ۷رجنوری ۱۹۹۳ء کو کاماکورا میں وفات پائی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں کائیو یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات میں ریسرچ فیلو مقرر رہوے۔جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انہی دِنوں میں ان کی ملاقات علامہ موسیٰ جار اللہ سے ہوئی اور اُنہوں نے اسلام، عربی زبان اور قرآن کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔اس وقت جاپان میں ان موضوعات میں علمی دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم کی تعداد بہت کم تھی۔اُنہوں نے بہت جلد اس میدان میں اپنا مقام بنا لیا اور ۱۹۴۹ء میں عربی، یونانی اور دیگر قدیم زبانوں کی تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔۱۹۵۴ء میں ادارہ لسانیات میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء کے دوران قرآن کریم کا جاپانی زبان میں ترجمہ مکمل کیا اور زیرِ نظر کتاب لکھی۔۱۹۶۰ء میں کائیو یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۲ء میں کینیڈا میں میکگل یونیورسٹی نے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے لیے دعوت دی۔مترجم کو یہیں ان سے شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں پروفیسر ازتسو کینیڈا سے ایران چلے گئے، جہاں فلسفہ کے ادارے سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۹ء میں جاپان واپس چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

پروفیسر ازتسو زندگی بھر بہت سے علمی اداروں سے وابستہ رہے، جن میں کائیو

یونیورسٹی جاپان، تہران یونیورسٹی، ایران، عربی اکادیمی مصر اور بین الاقوامی ادارہ برائے فلسفہ فرانس کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔

تصانیف:

پروفیسر ازتسو کی مختلف موضوعات پر تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ ان کی اکثر کتابوں کے یورپی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۳ء کے دوران ان کی تصانیف کا انتخاب بارہ جلدوں میں ٹوکیو سے شائع ہوا۔ ہم یہاں ان کی صرف ان کتابوں کا ذکر کریں گے، جن کا اسلامی علوم سے تعلق ہے۔ ہم ذیل میں کتابوں کے عنوانات کا اُردو ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اشاعت کی تاریخ کا ذکر ہے۔

جاپانی زبان میں ان کی چند کتابوں کے عنوان یوں ہیں:

۱۔ عرب فلسفہ کی تاریخ (۱۹۴۱ء)

۲۔ مشرقی ہندوستان میں فقۂ اسلامی کی تاریخ (۱۹۴۲ء)

۳۔ عربی زبان کی مبادیات (۱۹۴۹ء)

۴۔ حضرت محمد ﷺ (۱۹۵۹ء)

۵۔ افکارِ اسلامی کی تاریخ (۱۹۷۵ء)

۶۔ ظہورِ اسلام (۱۹۷۹ء)

۷۔ اسلامی ثقافت کی مبادیات (۱۹۸۱ء)

۸۔ فلسفۂ اسلامی کے مصادر (۱۹۸۲ء)

۹۔ مطالعۂ قرآن (۱۹۸۳ء)

۱۰۔ اسلامی اور یہودی روایاتِ فلسفہ میں انسان اور خدا (۱۹۹۱ء)

انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں اسلام سے متعلق ان کی چند تصانیف کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ کریم میں اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ (۱۹۵۹ء)
(اس کتاب کا ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔)

۲۔ وحی کے تصور کا لغوی تجزیہ (۱۹۶۲ء)

۳۔ اسلامی علم الکلام میں ایمان کا تصور (۱۹۶۵ء)

۴۔ تصوف اور تاؤمت کا تقابلی مطالعہ: ابنِ عربی اور لاؤتسے (۱۹۶۷ء)

۵۔ اسلام میں مابعد الطبیعیاتی فکر کا بنیادی ڈھانچہ (۱۹۷۱ء)

۶۔ نظریہ وحدت الوجود کا تجزیہ: فلاسفہ مشرق کا مابعد الفلسفہ فکر

۷۔ اسلامی مابعد الطبیعیات میں ماہیتِ وجود اور
کلیاتِ فطرت کا سلسلہ (۱۹۷۴ء)

۸۔ اسلامی تصوف اور زین بدھ مت میں تخلیقِ پیہم کا تصور (۱۹۷۷ء)

۹۔ میر داماد اور ان کا فلسفہ مابعد الطبیعیات (۱۹۷۷ء)

۱۰۔ تصوفِ اسلامی میں تجلیاتِ خودی کا مسئلہ:
نجم الدین کبری اور صوفی نفسیات (۱۹۷۸ء)

۱۱۔ قرآن میں انسان اور خدا:
قرآنی تصورِ کائنات کا معنویاتی مطالعہ (۱۹۸۰ء)

۱۲۔ اسلامی تصوف میں وحدتِ وجود اور تخلیق پیہم (۱۹۸۰ء)

۱۳۔ حکیم سبزواری کے مابعد الطبیعیات (۱۹۹۰ء)

پروفیسر ازتسو نے اسلامی موضوعات پر خود بھی لکھا اور مسا کا تا کے شیتا کے بقول جاپان میں اسلام کے بارے میں علمی تحقیق کی روایت کا آغاز بھی اُنہوں نے ہی کیا۔ ان کی علمی حیثیت جاپان میں ہی نہیں بلکہ ساری علمی دُنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت تمام تر جاپان میں ہوئی، لیکن اپنی علمی تصنیفات کے لیے اُنہوں نے زیادہ تر انگریزی زبان کو اختیار کیا۔ چنانچہ وہ جاپان سے زیادہ باہر کے ممالک میں معروف رہے۔ تاہم جاپان مین بھی

علومِ اسلامی کی پیشرفت میں ان کا اور ان کے شاگردوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ جاپان میں علومِ اسلامی کے مراکز حال ہی میں قائم ہوئے۔ عرصہ دراز تک جاپانی طلبہ اسلامیات کی تعلیم کے لیے زیادہ تر مصر اور ایران یا مغربی جامعات میں جاتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں جاپان میں مراکز قائم ہونے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبہ علومِ اسلامیہ اور ۱۹۸۷ء میں انٹرنیشنل یونیورسٹی آف جاپان میں ادارہ مطالعات مشرقِ وسطی قائم ہوئے۔ ادارہ مطالعات مشرقِ وسطی کے سربراہ توشیو کوروڈا پر ہفیسر ازتسو کے شاگرد ہیں۔ یہ ادارے علمی اور تحقیقی مجلّات بھی شائع کر رہے ہیں۔

جاپانی علما کی تصنیفات کے موضوعات میں ہمعصر سیاسی حالات کے علاوہ اسلامی فلسفہ، تصوف اور قرآنی علوم بھی شامل ہیں۔ کوجی رونا کامورا، شی گیرو کامادا اور آکیرو ماتسوموتو نے غزالی، ملا صدرا، علامہ قزوینی، روز بہان بقلی، دیلمی اور ابنِ عربی کے افکار پر تحقیقات شائع کی ہیں۔ ان میں کان کا گایا کی کتاب قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگی جس میں اُنہوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب ھمعات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ علومِ اسلامی میں قرآن اور عرفان کے موضوعات پر تصنیفات میں پروفیسر ازتسو کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ قرآنِ کریم کے جاپانی تراجم میں پروفیسر ازتسو کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ لیکن مطالعہ قرآن کا جو مخصوص طریقہ کار اُنہوں نے پیش کیا۔ اس کی جھلک ان کے شاگرد شینا ماکینو کی کتاب تخلیق اور ہلاکت میں دِکھائی دیتی ہے۔ اس موضوع پر قرآنی اصطلاحات کے تجزیے میں ماکینو نے ازتسو کا طریقِ کار اختیار کیا ہے۔ اسی طریقِ کار کو بنیاد بنا کر یوشیکو اوڈا نے قرآنِ کریم میں تقویٰ کے تصور کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جاپان میں پروفیسر ازتسو کے جاپانی تلامذہ میں شینا ماکینو (ٹوکیو یونیورسٹی)، توشیو کوروڈا (انٹرنیشنل یونیورسٹی آف جاپان)، اور ہیتو شیا گراراشی (توسکو بایو یونیورسٹی) کے نام نمایاں ہیں۔ شنیا ماکینو کا حدیث کے شعبے میں نمایاں کارنامہ صحیح بخاری کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہے۔

اس کتاب کے ترجمے میں بہت سے مسائل پیش آئے جن کا ذکر ضروری ہے۔ اُردو زبان کا اپنا مخصوص مزاج ہے جو لمبے اور پیچیدہ جملوں کا متحمل نہیں۔ ہم نے جہاں ممکن ہو سکا،

انگریزی کے پیچیدہ جملوں کو اُردو میں ترجمہ کرتے وقت ایک سے زیادہ سادہ جملوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ نقل حرفی کا ہے۔ انگریزی یا غیر اُردو ناموں کو اُردو میں کیسے لکھا جائے۔ ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ کتابوں کے عنوانات کا اُردو ترجمہ دے دیا ہے اور جہاں ضروری تھا۔ وہاں انگریزی حروف میں کتابوں کے عنوانات حواشی میں درج کر دیئے ہیں۔ یورپی مصنّفین کے ناموں کا مسئلہ مختلف ہے۔ کتابوں کے عنوانات کی طرح ان کا اُردو ترجمہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے تلفظ کی بنیاد پر ان کے نام اُردو حروف میں دے کر اصل نام حواشی میں درج کر دیئے ہیں۔ اسی طرح اُردو کے برعکس انگریزی زبان میں تعظیمی الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ ہم نے اُردو ترجمہ میں قرآنِ کریم اور حضرت محمد صلعم کو اختیار کیا ہے۔ اصل کتاب میں قرآنی آیات، احادیث، عربی اشعار اور عبارات کا انگریزی ترجمہ دیا گیا تھا۔ ہم نے قرآنی آیات اور احادیث کا اصل عربی متن دیا ہے۔ جہاں تک ہو سکا، تلاش کر کے عربی اشعار اور عبارات کا اصل عربی متن ترجمے میں شامل کیا ہے۔ اس تلاش میں اکثر مصنف کے ذکر کردہ مصادر کا حصول ممکن نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ہم نے حواشی میں اپنے مصادر کا حوالہ دے دیا ہے۔ آخر میں کائیو یونیورسٹی اور میکگل یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرنا ہے جو اس کتاب کے ناشرین ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔

محمد خالد مسعود

اسلام آباد